روایاتِ سیرت کی تحقیق کا حدیثی معیار

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر*

ABSTRACT

Seerah is a separate Islamic science from Hadith as their primary sources are different. Although there are some extents where there is over laying between them, but traditionally Seerah has different principles as compared to Hadith. The Scholars of Hadith were very strict in applying their rules whereas the scholars of Seerah were more flexible. The reason is, when academics were dealing with Ahadiths and deducing divine rulings, they wanted to make sure they were founding the rulings on Ahadiths that were authentic and sound. So that is why they applied very stringent rules to accept Ahadith. However, when it came to Seerah, they were more flexible in their rules, because they study this as history of The Prophet PBUH which does not touch the Sharia rulings. So, we find that writers of Seerah would accept narrations, they would not usually accept if they were dealing with Ahadith. This practice with Seerah narrations was followed by our early scholars. But recently, there is a new movement among some of our researchers that they wanted to apply the rules of Ahadith on Seerah. We do not agree this approach and in this article, we have had a humble effort to compile a set of rules for acceptance of Seerah narrations.

Keywords: مرسل، مغازی، ملاحم، تہذیب وتمدن، سرایا

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم انسانیہ، کامساٹس یونیورسٹی اسلام آباد، لاہور کیمپس، لاہور

تعارف

تحقیق وتخریج حدیث کی معاصر تحریک سے جو غیر معتدل تحقیقی مناہج اس امت میں رواج پاگئے، ان میں سے ایک منہج یہ بھی ہے کہ سیرت کے واقعات کی صحت وضعف کو اصول حدیث کی روشنی میں پرکھا جارہا ہے حالانکہ اصول حدیث اصلاً حدیث کی خبر کے تحقیق کے اصول ہیں نہ کہ تاریخ کی خبر کے تحقیق کے اصول۔ بلکہ اس سے بھی بڑی غلطی یا المیہ کہنا چاہیے یہ ہوا کہ قرآن مجید کی خبر کو بھی اصول حدیث کی روشنی میں پرکھا جانے لگا اور بہت سی قراءات جو کہ قرآن مجید کی خبر کے اصولِ تحقیق پر پوری اترتی ہیں، انہیں ضعیف قرار دے دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ حدیث کی تحقیق کے اصولوں کے مطابق نہ تھیں۔

یہاں تک کہ بعض محققین نے ہر فن یعنی قراءات، تفسیری اقوال، سیرت اور تاریخی واقعات تک پر اصول حدیث کی روشنی میں حکم لگانا شروع کر دیا۔ بلاشبہ اصول حدیث، حدیث کی تحقیق کے اصول ہیں اور حدیث ایک خبر ہے، لیکن خبر، خبر میں فرق ہوتا ہے لہذا ہر خبر کے تحقیق کے اصول ایک جیسے نہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ہیں۔ قرآن مجید کی روایات یعنی قراءات کی تحقیق کے اصول "اصول قراءات" ہیں۔ قراء کا جن ائمہ قراءات کی قراءات لینے پر اجماع اور اتفاق ہے، مثلاً امام حفص رحمہ اللہ کہ جن کی روایت سب سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے، محدثین کی جرح وتعدیل کی روشنی میں وہ ضعیف راوی ہیں اور بعض نے انہیں متروک الحدیث بھی کہا ہے۔[1]

اگر اصول حدیث کی روشنی میں قرآن مجید کی خبر کو پرکھا جائے گا تو قرآن بھی ثابت نہ ہو سکے گا۔ تفسیری اقوال، سیرت اور تاریخ وغیرہ شریعت نہیں ہیں کہ ان کے قبول ورد کے لیے اتنی سخت چھلنی لگائی جائے جو کہ حدیث کے لیے لگائی گئی ہے۔ اور اگر اصول حدیث کی چھلنی میں سے سیرت اور تاریخ کو گزارا جائے گا تو آپ کے پاس سیرت اور تاریخ کے نام پر کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ معتدل بات یہی ہے کہ قرآن مجید کی خبر کا ثبوت "اصول قراءات"، حدیث کی خبر کا ثبوت "اصول حدیث"، تفسیری اقوال کی خبر کا ثبوت "اصول تفسیر"، سیرت کی خبر کا ثبوت "اصول سیرت" اور تاریخ کی خبر کا ثبوت "اصول تاریخ" کی روشنی میں طے ہو گا۔

تفسیری اقوال کی صحت وضعف میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ اگر کوئی مرسل قول لمبا چوڑا ہے اور کسی اور راوی نے بھی اس کو بیان کیا ہے اور دونوں کے بیان میں اتفاق ہے، تو وہ مرسل قول قطعی طور صحیح ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتنا لمبا چوڑا قول دو افراد کے لیے اس طرح وضع کرنا کہ اس میں کوئی فرق نہ ہو، عقلی

---

[1] ۔ أبو المعاطي النوري وجماعة، موسوعة أقوال الإمام أحمد بن حنبل، عالم الكتب، بيروت، 1417ھ، 277:1

طور پر ممکن نہیں ہے جبکہ دونوں کی ملاقات بھی ثابت نہ ہو۔[1] اسی طرح سیرت کے متقدمین ائمہ مثلاً محمد بن عمر الواقدی رحمہ اللہ جب سیرت کا کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو ان کا انداز یوں ہوتا ہے کہ ہمیں ایک جماعت نے خبر دی ہے۔[2] تو ہر فن کی تدوین کے ساتھ اس کی تحقیق کے اصول، مناہج اور رویے بھی مدون ہوئے ہیں۔

یہی رویہ سیرت کے بیان میں ابن شہاب زہری رحمہ اللہ جیسے امام حدیث کا بھی ہے۔[3] گویا سیرت کو بیان کرتے ہوئے ان کی نظر میں راوی اہم نہیں بلکہ واقعہ اہم ہے جبکہ حدیث کے بیان میں راوی اہم ہے کیونکہ حدیث بطور شریعت نقل ہو رہی ہے اور سیرت بطور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ اور احوال زندگی کے بیان ہو رہی ہے۔ تو شریعت کے بیان میں اصل اہمیت بیان کرنے والے کی ہوتی ہے کہ اس کے بیان کو ہی ہم شریعت سمجھ رہے ہیں لیکن سیرت میں اصل اہمیت واقعے کی ہے نہ کہ سیرت نگار کی لہٰذا واقعے کو بطور واقعہ پرکھا جائے گا۔ اور واقعے کو پرکھنے کے بہت سے عقلی اور درایتی اصول ہیں مثلاً اس واقعے کے مختلف طرق ایک دوسرے کے خلاف نہ ہوں، عقل عام کے خلاف نہ ہو، مورخ کے عقیدے کی تائید نہ کرتا ہو وغیرہ وغیرہ۔[4]

روایات سیرت کو پرکھنے کا حدیثی معیار: واقدی کے تناظر میں

اب سیرت کے فن کو ہی لے لیں کہ سیرت رسول کے حالات زندگی یا نبوی تاریخ کا دوسرا نام ہے۔ سیرت کی کتب اور مصادر، حدیث وسنت کی کتب اور مصادر سے علیحدہ ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم محض حدیث وسنت کی تحقیق کے اصولوں پر سیرت کو پرکھنا شروع کر دیں؟ حدیث وسنت کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی زندگی سے ہے جبکہ سیرت کا تعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محض زندگی سے ہے، چاہے وہ بشری ہے یا نبوی۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ سیرت میں شرعی زندگی کا بھی بیان ہے تو سیرت کا وہ حصہ جو شرعی زندگی کے بیان سے متعلق ہے تو اس کے متعلق یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے معیار تحقیق اصول حدیث یا مصطلح الحدیث ہی کو بنانا چاہیے، لیکن ہماری اس وقت مراد سیرت کا وہ حصہ ہے کہ جس کا تعلق مغازی وغیرہ سے ہے۔

اگر ہم محدثین کے معیار پر سیرت کو پرکھنا شروع کر دیں تو سیرت کے ابتدائی مصادر بھی اڑ جاتے ہیں اور کچھ

---

[1] ۔ ابن تيمية، أحمد بن عبد الحليم، مقدمة في أصول التفسير، دار مكتبة الحياة، بيروت، 1490هـ، ص: 25

[2] ۔الواقدي، محمد بن عمر، المغازي، دار الأعلمي، بيروت، الطبعة الثالثة، 1409هـ، 2:1

[3] ۔ محمد بن محمد العواجي، مرويات الإمام الزهري في المغازي، الجامعة الإسلامية بالمدينة، 1425هـ، 159:1

[4] ۔ابن خلدون، عبد الرحمن بن محمد، ديوان المبتدأ والخبر، بيروت، الطبعة الثانية، 1408هـ، 17:1، 20، 26، 29

باقی نہیں رہ جاتا۔ مثلاً سیرت کے ابتدائی مصادر میں واقدی[130-207ھ] کی کتاب "المغازی" کا تذکرہ ملتا ہے کہ جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی جنگوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ ابن ندیم رحمہ اللہ نے اپنی فہرست میں واقدی کی چالیس کے قریب تصانیف کا تذکرہ کیا ہے۔[1] واقدی کے اساتذہ میں امام اوزاعی اور امام مالک جیسے ائمہ دین کا تذکرہ ملتا ہے[2] جبکہ ان کے شاگردوں میں ابن ابی شیبہ، ابوعبید قاسم بن سلام اور امام شافعی رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر لوگ شامل ہیں۔[3] واقدی کی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ محمد بن سعد رحمہ اللہ جیسے مورخ یعنی طبقات ابن سعد والے، واقدی کے کاتب رہے ہیں۔[4] ابن اسحاق رحمہ اللہ کے بعد واقدی سیرت میں دوسرا بڑا ماخذ ہے۔ اس واقدی کے بارے میں جو آج سیرت کا دوسرا بڑا ماخذ ہے، محدثین کے اقوال کیا ہیں؟ ذرا ملاحظہ فرمائیں: یحیی بن معین رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کی حدیث لکھنے کے قابل بھی نہیں، امام نسائی رحمہ اللہ نے کہا کہ حدیثیں گھڑنے والوں میں سے ہے، امام ابوزرعہ رحمہ اللہ نے کہا کہ محدثین نے اس سے حدیث لینا چھوڑ دی۔[5] امام احمد نے "کذاب" کہا[6] جبکہ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے "متروک الحدیث" کہا۔[7] اسحاق بن راہویہ اور ابو حاتم رازی سے منقول ہے کہ حدیثیں گھڑتا ہے اور العقیلی رحمہ اللہ نے کہا کہ "متروک الحدیث" ہے۔[8] امام دارقطنی نے بھی ضعیف کہا جبکہ امام نووی اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کے ضعیف ہونے پر محدثین کا اتفاق نقل کیا ہے۔[9]

محدثین نے اس پر جو جرح کی ہے، وہ حدیث کے حوالے سے کی ہے کہ وہ حدیث و سنت کے بیان میں ضعیف ہے جیسا کہ خود محدثین ہی کی ایک جماعت کا واقدی کو سیرت میں بطور ماخذ لے لینے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود محدثین کی جماعت حدیث اور سیرت کے معیار تحقیق میں فرق کو روا رکھتی ہے۔ امام

---

[1] ۔ ابن النديم، محمد بن إسحاق الوراق، الفهرست، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية، 1417 هـ، ص 127-128

[2] ۔ الذهبي، محمد بن أحمد بن عثمان، سير أعلام النبلاء، مؤسسة الرسالة، الطبعة الثالثة، 1405 هـ، 454:9

[3] ۔ المزي، جمال الدين يوسف، تهذيب الكمال في أسماء الرجال، مؤسسة الرسالة، بيروت، 1400هـ، 181:26

[4] ۔ الفهرست، ص: 128

[5] ۔ سير أعلام النبلاء: 462:9-463

[6] ۔ تهذيب الكمال في أسماء الرجال: 186:26

[7] ۔ سير أعلام النبلاء: 457:9

[8] ۔ العسقلاني، أحمد بن علي، تهذيب التهذيب، مطبعة دائرة المعارف النظامية، الهند، 1326هـ، 367:9

[9] ۔ تهذيب التهذيب: 368:9

ذہبی رحمہ اللہ نے واقدی کو حدیث میں بالاتفاق ضعیف قرار دینے کے باوجود امام اور علامہ لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ مغازی اور سیرت میں واقدی سے مستغنی رہنا ممکن نہیں ہے۔[1] ایک اور جگہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ واقدی اگرچہ ضعیف ہے، لیکن غزوات اور تاریخ میں ہم اس کے محتاج ہیں البتہ ہم اس کی روایات سے کوئی شرعی استدلال نہیں کریں گے۔[2] خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے بھی واقدی پر محدثین کی جرح نقل کرنے کے باوجود اسے سیرت، مغازی اور طبقات کے علوم وفنون کا ایک ایسا مصدر مانا ہے کہ جس کی شہرت مشرق ومغرب میں پھیلی ہوئی ہے۔[3] یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ، واقدی پر شدید نقد بھی کرتے ہیں، لیکن دوسری طرف اس سے روایت بھی نقل کر لیتے ہیں۔[4] بعض محققین کا کہنا یہ ہے کہ واقدی پر محدثین کی نقد کی اصل وجہ یہ تھی کہ واقدی، محدثین کے منہج تحقیق کے مطابق روایات سیرت کو بیان نہیں کرتے تھے۔ ہماری رائے میں یہ بات آدھی درست ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ واقدی کا منہج، محدثین کے منہج تحقیق سے مختلف تھا کہ واقدی کتب سے بھی نقل کر لیتے تھے جبکہ محدثین اس کو درست نہیں سمجھتے تھے جب تک کہ سماع ثابت نہ ہو جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے واقدی پر جرح کی ایک وجہ اس کے اسی رویے کو بنایا ہے۔[5] دوسرا واقدی ایک ہی موضوع سے متعلق مختلف اسناد سے مروی متن کو علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ ایک ہی متن کے طور پیش کر دیتے تھے اور محدثین اس کو عیب سمجھتے ہیں جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے واقدی پر اپنی جرح کی دوسری وجہ یہی بیان کی ہے۔[6] ابراہیم الحربی جو واقدی کے بارے اس قول کو امام احمد سے نقل کرتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ امام احمد کی اس جرح کی وجہ سمجھ نہیں آتی جبکہ یہی کام تو واقدی سے پہلے ابن اسحاق اور ابن شہاب رحمہما اللہ بھی کر چکے تو وہ مجروح کیوں نہیں ہیں؟[7]

---

[1] ۔ سير أعلام النبلاء: 9:454-455

[2] ۔ سير أعلام النبلاء: 9:469

[3] ۔ الخطيب البغدادي، أحمد بن علي بن ثابت، تاريخ بغداد، دار الغرب الإسلامي، بيروت، 1422ھ، 4:5-6

[4] ۔ الشافعي، محمد بن إدريس، المسند، دار الكتب العلمية، بيروت، 1400 ھ، ص 359

[5] ۔ أحمد بن محمد بن حنبل، العلل ومعرفة الرجال، دار الخاني، الرياض، الطبعة الثانية، 1422 ھ، 3:258

[6] ۔تاريخ بغداد: 4:20

[7] ۔ ايضاً

واقدی سے پہلے، ابن اسحاق اور ان سے پہلے ابن شہاب زہری ﷫ بھی یہی کام کرتے تھے[1] البتہ وہ یہ کام سیرت میں کرتے تھے لہذا سیرت میں اس کے جواز کے قائل تھے کہ مختلف اسناد سے مروی متن کو ایک ساتھ ہی بیان کر دیا جائے کہ اصل متن ہے نہ کہ سند۔ محدثین کو اس طریقے پر جو اختلاف تھا، وہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ حدیث اور سیرت کے مناہج تحقیق کو مختلف نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ دو مختلف میدان ہیں اور ان کے تحقیقی مناہج بھی مختلف ہیں، اسی لیے تو ابن شہاب زہری ﷫ نے اس فرق کا عملاً لحاظ کیا ہے۔ سختی کی وجہ یہ تھی کہ محدثین کی ایک جماعت کے نزدیک یہ دونوں مضامین یعنی حدیث اور سیرت اس قدر ایک دوسرے سے خلط ملط ہیں کہ ان کو کلی طور علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ لیکن دوسری طرف سیرت کا فن مدون کرنے والوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ائمہ فن کے لیے اس فرق کا لحاظ کرنا اور رکھنا ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقدی سے جب تقاضا کیا گیا کہ وہ اپنے متن کی علیحدہ علیحدہ اسناد بیان کیا کریں تو انہوں نے صرف غزوہ احد کو جب متنوع اسناد کے ساتھ بیان کیا تو وہ 20 جلدیں بن گئیں۔[2] اس پر ان کے شاگردوں نے اپنے مطالبے سے رجوع کر لیا کہ یہ شرعی احکامات تو ہیں نہیں کہ جن کے لیے اس قدر اسناد کا علم محفوظ رکھنے کی مشقت اٹھائی جائے۔

روایات سیرت کو پرکھنے کا حدیثی معیار: ابن اسحاق کے تناظر میں

ابن اسحاق [85-151ھ] سیرت کے اولین مصادر میں سے ہیں بلکہ انہیں فن سیرت نگاری کا امام کہا جاتا ہے کہ "سیرت ابن اسحاق" یا "السیرۃ النبویۃ" سیرت کی پہلی باقاعدہ اور اولین تصنیف شمار ہوتی ہے کہ جس کا خلاصہ ابن ہشام نے "سیرت ابن ہشام" میں پیش کیا اور وہ آج ہمارے پاس موجود ہے۔ ابن اسحاق، امام ابن شہاب الزہری کے خاص شاگردوں میں سے ہیں اور اس کے علاوہ انہوں نے محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب، قاسم بن محمد بن ابی بکر، ابان بن عثمان بن عفان، ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوف ﷭ سے بھی استفادہ کیا۔ حضرت انس بن مالک ﷛ کو بھی دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔[3] دوسری طرف محدثین کے ہاں ابن اسحاق

---

[1] ۔ عبد العزيز السلومي، الواقدي وكتابه المغازي منهجه ومصادره، الجامعة الإسلامية، المدينة المنورة، ص: 193

[2] ۔ سير أعلام النبلاء: 460:9

[3] ۔ تاريخ بغداد: 7:2

رحمہ اللہ کا کوئی خاص رتبہ نہیں ہے۔ امام مالک نے تو انہیں "دجال" کا لقب دیا[1] جبکہ امام احمد اور امام دار قطنی رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ "حجت" نہیں ہے۔[2] امام نسائی نے کہا کہ وہ "قوی" نہیں ہے، یحی بن معین نے کہا کہ ضعیف ہے[3] جبکہ یحی القطان رحمہ اللہ نے کہا کہ کذاب ہے۔[4] امام ابن حجر نے کہا کہ ضعیف اور مجہول راویوں سے تدلیس میں مشہور ہے، لیکن حدیث میں ضعیف ہونے کے باوجود سیرت میں انہیں امام مانا گیا ہے جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا کہ جو مغازی یعنی غزاوت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تبحر حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کا محتاج ہے۔ اور امام ذہبی نے کہا کہ ابن اسحاق، مغازی میں علامہ تھے۔[5]

تو محدثین نے موضوع موضوع کا فرق کیا ہے کہ کسی کو حدیث میں ضعیف قرار دے کر سیرت میں نہ صرف قبول کیا بلکہ امام بھی مانا ہے۔ اور اس حوالے سے ائمہ کے اقوال میں غور کرنے والوں کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ مثال کے طور امام احمد جب ابن اسحاق پر نقد کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اسے سنت اور حدیث کے بیان میں حجت نہیں مانا جائے گا۔[6] یہی رویہ ہمیں امام احمد رحمہ اللہ کی واقدی پر نقد میں نظر آتا ہے کہ حدیث کے سیاق میں واقدی کو نقد کا نشانہ بناتے ہیں جیسا کہ ان کا کہنا ہے: "ہم تو واقدی کا دفاع کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ اس نے معمر عن زہری عن نبہان عن ام سلمہ سے حدیث بیان کی کہ....۔"[7] امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول تو بہت معروف ہے کہ تین قسم کے اقوال کی کوئی سند نہیں ہوتی؛ مغازی، ملاحم اور تفسیر یعنی تفسیری اقوال کی۔[8] امام احمد رحمہ اللہ کے اس قول کے دو معنی کیے گئے ہیں؛ ایک یہ کہ ان تینوں مضامین کی کوئی مرفوع اور متصل سند نہیں پائی جاتی بلکہ اس

---

[1] ۔سیر أعلام النبلاء: 50:7
[2] ۔ أیضاً: 46:7، 54
[3] ۔ أیضاً: 47:7
[4] ۔ أیضاً: 49:7
[5] ۔ أیضاً: 37:7
[6] ۔أیضاً: 46:7
[7] ۔سیر أعلام النبلاء: 455:9
[8] ۔ مقدمة في أصول التفسیر: ص: 22

بارے اکثر و بیشتر مرسل اور منقطع یعنی ضعیف روایات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔[1] یہ معنی جمہور علماء نے بیان کیا ہے۔ دوسرا معنی یہ کیا گیا کہ غزوات، جنگوں اور تفسیری اقوال کی سند تلاش نہیں کرنی چاہیے کہ سند ہے ہی نہیں۔ ہے ہی نہیں کا لفظ مبالغۃً بولا گیا کہ اکثر و بیشتر ان کی سند نہیں ہے۔

کوئی واقعہ بغیر سند کے نقل ہوا ہے اگر تو اس کے غلط ہونے کا امکان ہے تو صحیح ہونے کا امکان بھی برابر کی سطح پر موجود ہے۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق اسی لیے تو اسرائیلیات کی تصدیق و تکذیب سے منع کیا گیا کہ ہو سکتا ہے کہ تم اس کی تکذیب کرو اور وہ صحیح بات ہو۔[2] حدیث بغیر سند کے نقل نہیں ہو سکتی، لیکن سیرت کا واقعہ نقل ہو سکتا ہے جبکہ اس واقعے کا تعلق شرعی زندگی کے بیان سے نہ ہو۔ واقدی محدثین کے ہاں کتنا ہی کذاب اور ضعیف سہی، لیکن اس کی بھی دس روایات ایسی ہیں جنہیں صحیحین میں سے دونوں یا ایک کی تصدیق حاصل ہے۔[3] تو یہ سطحی بات ہے نا کہ ہم نے صحیحین کی صحت کی وجہ سے ان روایات کو مانا ہے۔ گہری بات یہ ہے کہ صحیحین کی روایت نہ ہوتی تو بھی واقدی کی روایت صحیح تھی، یہ ہمیں صحیحین کی روایت نے بتلایا ہے۔

سیرت کی تحقیق کا حدیثی معیار: احادیث اور روایات سیرت کے تقابلی مطالعے کے تناظر میں

سیرت اور تاریخ دو قسم پر ہے؛ ایک وہ جس کی سند ہے اور دوسری وہ جس کی سند ہی نہیں ہے۔ اب جس کی سند ہے، وہ پھر دو قسم پر ہے؛ ایک وہ جس کی سند صحیح یا متصل ہے اور دوسری وہ جس کی سند ضعیف یا منقطع ہے۔ چلیں، ہم سب سے پہلے اس سیرت اور تاریخ پر گفتگو کرتے ہیں کہ جس کی سند صحیح اور متصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ محدثین نے کتب احادیث میں سیرت اور تاریخی واقعات کو بیان کیا ہے اور ان کے بیان میں سند کے اعلیٰ معیار کا اہتمام کیا گیا ہے اور یہ بہت اچھی بات ہے۔ مثال کے طور پر واقدی اگرچہ بہت بڑا سیرت نگار ہے، لیکن سیرت کے کسی واقعے کے بارے اس کی خبر اگر صحیح بخاری کی خبر سے ٹکرا جائے گی تو ہم صحیح بخاری ہی کی خبر کو اس کی صحت کی بناء پر ترجیح دیں گے، یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔

لیکن ہر صورت ایسا ہی ہو گا تو یہ اصولاً درست نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر سیرت نگاروں کا کسی مسئلے میں

---

[1] ۔ مقدمة في أصول التفسير: ص: 22

[2] ۔البخاري، محمد بن إسماعيل، الجامع المسند الصحيح، دار طوق النجاة، مصر، 1422ھ، 170:4

[3] ۔ الواقدي وكتابه المغازي منهجه ومصادره، ص: 403-420

اتفاق ہو جائے تو یہ اتفاق ایک بڑی وزنی دلیل ہے اور اسے اہمیت دینی چاہیے۔ماہرین فن کے اتفاق کی ہر فن میں ایک اہمیت ہوتی ہے جو کہ مسلم ہے۔پس اگر سیرت نگاروں کے اتفاق کے مقابلے میں کوئی صحیح روایت نقل ہو جائے کہ جس میں سیرت کے کسی واقعے کا بیان اس طرح نہ ہو جیسا کہ مصادر سیرت میں بیان ہوا ہے تو ہم اس روایت کو مرجوح قرار دیں گے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی روایت کی سند صحیح ہونے کا بہر صورت مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ امر واقعہ میں واقعہ بھی ایسے ہی ثابت ہے۔امام ابن صلاح فرماتے ہیں کہ جب محدثین یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس کی سند متصل ہے اور اس میں صحیح حدیث کی تمام شرائط مذکور ہیں۔اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ امر واقعہ بھی قطعی طور ایسا ہی ہو جیسا کہ صحیح حدیث میں بیان ہوا ہے۔(1)

اب اس اصول کی تطبیق میں ایک مثال کو ہم بیان کرتے ہیں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں واقعہ معراج کو ((قبل أن يُوحَى إليه)) کے الفاظ کے ذریعے نبوت سے پہلے کا واقعہ قرار دیا گیا ہے[2] حالانکہ سیرت نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ واقعہ معراج، نبوت کے بعد ہوا ہے۔اور نبوت سے پہلے اس واقعے کی کوئی وجہ ہی نہیں بنتی۔اسی لیے امام خطابی، امام ابن حزم، عبد الحق اشبیلی، قاضی عیاض، امام نووی اور علامہ ابن حجر رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ راوی کا وہم ہے۔علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ اہل علم کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ نمازیں معراج کی رات فرض ہوئی تھیں تو نماز نبوت ملنے سے پہلے کیسے فرض ہو سکتی ہے؟(3)

اسی طرح صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے:عن ابنِ عبَّاس: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال يومَ أحُدٍ: ((هذا جبريلُ آخِذٌ برأسِ فَرَسِه، عليه أداةُ الحَربِ))۔(4)"ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احد والے دن یہ کہا کہ یہ جبریل علیہ السلام اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے آ رہے ہیں۔ حالانکہ سیرت نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ ملائکہ کا نزول یوم بدر میں ہوا نہ کہ یوم احد میں۔یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن حجر

---

[1]۔ ابن الصلاح، عثمان بن عبد الرحمن، معرفة أنواع علوم الحديث، دار الفكر المعاصر، بيروت، ص: 14-15

[2]۔ صحيح البخاري: 191:4، 149:9

[3]۔ العسقلاني، أحمد بن علي بن حجر، فتح الباري، دار المعرفة، بيروت، 1379ھ، 480:13

[4]۔ صحيح البخاري: 94:5

رحمہ اللہ نے اسے راوی کا وہم قرار دیا ہے۔[1] اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے صحیح بخاری ہی کی روایت میں یہی متن "یوم بدر" کے الفاظ کے ساتھ بھی نقل ہوا ہے۔[2] ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ اس سے صحیح بخاری کی روایت ضعیف ہو جاتی ہے، وہ روایت اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن روایت کو من جملہ صحیح مان لینے کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ اس روایت کا ہر ہر لفظ امر واقعی میں بھی صحیح ہے، اور تاریخی حقیقت کے مطابق ہے کیونکہ تاریخی حقیقت کے بیان میں الفاظ اصلاً صحابہ کا بیان ہیں نہ کہ بیانِ رسول صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لہذا ان میں غلطی کا امکان ہے۔ تو یہ روایت صحیح ہے سوائے ایک لفظ کے کہ احد کی جگہ اصلاً بدر کے الفاظ ہیں۔ تو ایک لفظ کے وہم سے روایت ضعیف نہیں ہو گئی بلکہ وہ لفظ ثابت نہیں ہوا جبکہ بقیہ روایت ثابت ہے۔

اسی طرح صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے تین چیزیں مانگیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ آپ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ان کی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیں تو رسول اللہ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ان کی اس خواہش کا احترام کیا اور اسے قبول کر لیا۔[3] امام ابن قیم رحمہ اللہ اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے کیونکہ سیرت نگاروں اور مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا جبکہ وہ حالت ہجرت میں حبشہ میں تھیں اور ان کا خاوند مرتد ہو گیا تھا تو نجاشی نے ان کا حق مہر چار سو دینار ادا کیا تھا۔ پھر سیرت نگاروں اور مورخین میں یہ واقعہ بھی بہت معروف ہے کہ جب صلح حدیبیہ کی مشرکین کی طرف سے خلاف ورزی ہوئی تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ اس صلح کی تجدید کے لیے مدینہ تشریف لے گئے اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد کو اس لیے بستر پر نہیں بیٹھنے دیا کہ وہ نجس ہیں اور یہ رسول اللہ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا بستر ہے۔ تو امام ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ راوی کا وہم ہے۔ البتہ یہ امکان موجود ہے کہ ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے اپنی دوسری بیٹی رملہ کو نکاح کے لیے پیش کیا ہو، لیکن اللہ کے رسول صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس کا انکار کر دیا ہو کیونکہ دو بہنوں کو ایک ساتھ جمع کرنا اسلام میں جائز نہیں ہے۔[4]

---

[1] فتح الباري: 349:7

[2] صحيح البخاري: 81:5

[3] مسلم بن الحجاج النيسابوري، المسند الصحيح، دار إحياء التراث، العربي، بيروت، 1945:4

[4] ـابن قيم الجوزية، زاد المعاد في هدي خير العباد، مؤسسة الرسالة، بيروت، 1415هـ، 1:106-108

ماہرین فن کا اتفاق ایک بہت بڑا اصول ہے کہ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سیرت ایک فن ہے اور اس کے کچھ ماہرین ہیں اور ان کا کچھ واقعات پر اتفاق ہے۔ اب سیرت کے ان حقائق کے خلاف صحیح سے صحیح خبر بھی آ جائے، صحیح سے صحیح حدیث کی کتاب میں آ جائے، تو آپ کو اس خبر پر غور کرنا پڑے گا اور اس کی تاویل کرنا پڑے گی نہ کہ ماہرین فن کے اتفاق اور اجماع کا انکار کر دیں۔ ہر فن کا ایک مزاج ہے اور اس مزاج کے مطابق اس کی نقل کا ایک معیار مدون ہوا ہے لہذا اس فن کو کسی دوسرے فن کے معیار پر پرکھنا درست نہیں ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ہم صحیح مسلم کی روایت کو قبول کریں گے اور سیرت نگاروں کے اتفاق کا انکار کریں گے اور یہ کہیں گے کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فتح مکہ کے موقع پر ہی ہوا ہے تو یہ طریقہ باطل ہے اور ہر وہ شخص اسے باطل کہے گا جس کے پاس سیرت اور تاریخ کا تھوڑا سا بھی علم ہو گا۔[1]

سیرت کی تحقیق کا حدیثی معیار: محدثین اور معاصر اہل علم کی آراء کی روشنی میں

اب تک کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث کی تحقیق کا معیار اور سیرت کی تحقیق کا معیار فرق ہے۔ یہ تو پہلی بات ہوئی۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خود محدثین نے حدیث کے تحقیقی معیار اور سیرت و تاریخ کے تحقیقی معیار میں فرق کو روا رکھا ہے۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ حدیث کی تحقیق و تخریج سے شغل رکھنے والے معاصر علماء میں سے بعض کا موقف یہ ہے کہ سیرت اور تاریخ کی تحقیق کے لیے بھی حدیث کی صحت و ضعف کے معیار ہی کو واحد معیار بنایا جائے گا اور ہمیں اس موقف سے اتفاق نہیں ہے۔ اس موقف کے حاملین پھر آگے تین مناہج میں منقسم ہو گئے کہ جس پر ہم آگے چل کر گفتگو کرتے ہیں۔ چوتھا نکتہ یہ ہے کہ حدیث کی تحقیق و تخریج سے شغل رکھنے والے علماء کی ایک جماعت نے تیسرے نکتے کے تحت بیان ہونے والے محققین کے موقف کا رد کرتے ہوئے محدثین کے منہج کا احیاء کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیث اور سیرت کے تحقیقی معیار میں فرق کو روا رکھا جائے گا اور حدیث کا تحقیقی معیار سیرت پر بعینہ جاری نہیں کیا جائے گا۔ اور اس احیائی تحریک میں پھر ہمیں دو قسم کے مناہج ملتے ہیں۔

وہ اہل علم جو سیرت اور تاریخ کو حدیثی معیار پر پرکھنے کے قائل ہیں تو ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے ضعیف روایت کو کسی صورت قبول نہیں کیا جیسا کہ ڈاکٹر محمد بن عبد اللہ العوشن کی کتاب "ما شاع ولم يثبت في

---

[1] ۔زاد المعاد في هدي خير العباد: 107:1

السيرة النبوية" اسی منہج پر مرتب کی گئی ہے اور انہوں نے اپنی کتاب میں سیرت کے 54 معروف واقعات کو صرف اس بنا پر رد کر دیا کہ وہ حدیثی معیار پر پورا نہیں اترتے ہیں۔ انہوں نے فجار کی جنگ میں رسول اللہ ﷺ کی شرکت، شادی کے وقت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر کا چالیس سال ہونا، رسول اللہ ﷺ کی شروع کی خفیہ دعوت کا تین سال ہونا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعے، طائف سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ کی دعا "اللهم إليك أشكو ضعفي"، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہجرت کے موقع پر بستر رسول پر سونا، سراقہ کے لیے کسری کے کنگن کے حصول کی بشارت اور مسجد ضرار کو جلا دینے جیسے واقعات کو ناقابل اعتبار کہا ہے۔ محمد بن احمد الصویانی کی کتاب "الصَّحيحُ من أحاديث السّيرة النبوية" بھی اسی منہج پر ہے۔[1]

اسی موقف کی حامل اہل علم کی ایک دوسری جماعت ایسی ہے کہ جس نے بعض ضعیف روایات کو سیرت میں کچھ شرائط کے ساتھ قبول کیا ہے جیسا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "صحيح السيرة النبوية" کا منہج بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے اپنی اس کتاب میں سیرت کے ہر اس واقعے کو شامل نہیں کیا کہ جس کی سند نہیں ہے یا اس کی سند مرسل ہے یا معضل ہے الا یہ کہ اس واقعے کے بیان پر اہل علم کا اتفاق ہو تو [پھر منقطع سند کے ساتھ بھی واقعہ بیان کر دیا ہے]۔ علامہ البانی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں: "حذفت ما لا سند له أو كان مرسلا أو معضلا إلا ما صرح بأنه مجمع عليه أو نحوه"۔[2] تو سیرت کی جمع و تدوین اور تحقیق و تنقیح کا یہ منہج تو ان معاصر علماء کا ہے جنہوں نے حدیثی معیار کو سختی کے ساتھ سیرت پر لاگو کیا ہے۔ علماء کی اس جماعت میں تیسرا منہج عبد الکریم عکوی نے متعارف کروایا کہ انہوں نے اپنی کتاب "جهود علماء المسلمين في تمييز صحيح السيرة النبوية من ضعيفها" میں واقعات سیرت کو درجات کے اعتبار سے تقسیم کر دیا۔

دوسری طرف وہ علماء جو حدیثی معیار کو سختی سے سیرت پر لاگو نہیں کرتے ہیں تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو سیرت کی تحقیق کے لیے حدیثی معیار کو نرم کر دیتے ہیں اور سیرت کی تحقیق کے لیے کسی علیحدہ معیار کا ذکر نہیں کرتے۔ اور بعض علماء ایسے ہیں جو سیرت کی تحقیق کے لیے نہ صرف حدیثی معیار کو نرم کر دیتے ہیں بلکہ اس کے

---

[1] ۔ محمد بن عبد الله العوشن، ما شاع ولم يثبت في السيرة النبوية، دَارُ طَيبة، الرياض، ص: 233

[2] ۔ألباني، محمد ناصر الدين، صحيح السيرة النبوية، المكتبة الإسلامية، عمان، الطبعة الأولى، ص: 6

ساتھ ایک علیحدہ معیار کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی مثال میں عبد الرحمن الفالوذۃ کی کتاب "الموسوعة في صحيح السيرة النبوية" کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں یہ بیان کیا ہے کہ ہم نے اس کتاب میں ان روایات کو بھی شامل کیا ہے جو سند میں تو ضعیف ہیں، لیکن متن میں صحیح ہیں جبکہ وہ روایات عقائد واحکام کے بجائے رسوم ورواج اور تہذیب وتمدن سے متعلق ہوں۔[1] اب کتاب کے نام میں "صحيح السيرة" کے الفاظ ہیں بلکہ یہ کتاب صحیح سیرت کا انسائیکلوپیڈیا ہے، لیکن مصنف اس کتاب میں ضعیف روایات کو بھی ایک منہج کے تحت لائے ہیں کیونکہ محدثین نے حدیث میں ضعیف روایت کو قبول نہیں کیا، لیکن سیرت میں قبول کیا ہے اور اس بارے ہم امام احمد اور خطیب بغدادی رحمہما اللہ وغیرہ کے اقوال بیان کر چکے ہیں کہ مغازی یعنی غزوات اور جنگوں کے بیان میں ضعیف اقوال قابل قبول ہیں۔ ابراہیم بن محمد العلی نے بھی اسی منہج کے تحت صحیح سیرت کو جمع کیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب "صحيح السيرة النبوية" میں ان ضعیف روایات کو قبول کیا ہے کہ جن کا تعلق عقیدے یا احکام سے نہیں ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ تاریخ میں ضعیف روایات قابل قبول ہیں۔[2]

بعض علماء جو کہ سیرت کی تحقیق کے لیے نہ صرف حدیثی معیار کو نرم کر دیتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک علیحدہ معیار کا بھی ذکر کرتے ہیں، ان میں دو بڑے نام ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری اور شیخ حاتم شریف العونی کے ہیں۔ ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کا کہنا ہے کہ بعض اوقات کسی تاریخی واقعے کو قبول کرنے کے لیے زمانے کے مورخ کی عدالت اور ضبط ہی کافی ہوتا ہے، سند ضروری نہیں ہوتی۔[3] یہی بات خطیب بغدادی رحمہ اللہ سے حاتم شریف صاحب نے ان الفاظ میں نقل کی ہے: "ما لايفتقر كتْبُه إلى إسناد"۔[4] یعنی کچھ اخبار ایسی ہیں کہ جن کے لکھنے یا نقل کرنے کے لیے سند ضروری نہیں ہے۔ اب بغیر سند کے واقعے کو بیان اور قبول کرنا تو حدیثی معیار نہیں ہے بلکہ تاریخی معیار ہے۔

ہم نے ذکر کیا تھا کہ سیرت اور تاریخ دو قسم پر ہے؛ ایک وہ جس کی سند متصل اور صحیح ہے اور دوسری وہ جس

---

[1] ۔محمد إلياس عبد الرحمن الفالوذة، الموسوعة في صحيح السيرة النبوية، مطابع الصفا، مكة، 1423 هـ، ص: 2

[2] ۔ إبراهيم بن محمد بن حسين العلي، صحيح السيرة النبوية، دار النفائس، الأردن، 1415 هـ، ص: 11

[3] ۔ د. أكرم ضياء العمري، السِّيرةُ النَّبَوِيَّةُ الصَّحِيْحَةُ، مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة، 1415 هـ، ص: 45

[4] ۔ الخطيب البغدادي، أحمد بن علي، الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع، مكتبة المعارف، الرياض، 213:2

کی سند ضعیف ہے یا بالکل ہے ہی نہیں۔ تو سیرت اور تاریخ کی پہلی صورت تو سب کے نزدیک مستند ترین صورت ہے، لیکن اختلاف اس میں ہے کہ وہ سیرت اور تاریخ جو ضعیف سند سے مروی ہے یا جس کی بالکل سند ہی نہیں ہے تو کیا ہمیں اسے بالکل چھوڑ دینا چاہیے یا اس میں سے بھی لے سکتے ہیں۔؟ تو معاصر علماء کی ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ ہمیں صرف اسی سیرت اور تاریخ کو نقل کرنا ہے جو صحیح اور متصل سند کے ساتھ مروی ہے اور محدثین کے تحقیقی منہج اور معیار پر پوری اترتی ہے۔ یہ موقف علامہ البانی رحمہ اللہ کا ہے اور انہوں نے اپنے اس موقف کے مطابق ایک مختصر "صحيح السيرة النبوية" بھی مرتب کی ہے۔

اس کے برعکس معروف سیرت نگار ڈاکٹر ضیاء اکرم العمری کا موقف یہ ہے کہ اگر ہم صرف صحیح اور متصل سند سے مروی سیرت اور تاریخ تک اپنے آپ کو محدود کر لیں گے تو ہم سیرت اور تاریخ کے ایک بڑے ذخیرے سے محروم ہو جائیں گے۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ محدثین کے ہاں سیرت اور تاریخ کی تحقیق کا معیار، حدیث کی تحقیق کے معیار سے مختلف تھا۔ کسی واقعے کے بیان میں وقت کے مورخ کی عدالت اور ضبط ہی کافی ہے، لیکن اگر تو کسی واقعے میں مورخین کے بیان میں اختلاف ہو گا تو ہم حدیثی معیار کی طرف متوجہ ہوں گے۔[1] ایک اور جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ عقائد اور شرع کے بیان میں تو نہیں، لیکن تہذیب و تمدن اور صنعت و حرفت وغیرہ کے باب میں ضعیف روایات کو بیان کیا جا سکتا ہے۔[2]

معروف محدث شیخ حاتم الشریف کا بھی یہی موقف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر سیرت سے کوئی شرعی حکم ثابت ہو تا ہو گا تو اس کی تحقیق پر حدیثی معیار لاگو ہو گا، لیکن اگر سیرت کے کسی واقعے سے کوئی شرعی حکم اخذ نہ ہو تا ہو جیسا کہ سرایا کی تاریخ، ان میں شامل ہونے والوں کی تعداد، ان کے واقع ہونے کا وقت اور مقام وغیرہ تو اس کی تحقیق میں حدیثی معیار لاگو نہ ہو گا۔[3] شیخ حاتم الشریف نے بھی اس موقف کی نسبت متقدمین محدثین کی طرف کی ہے کہ وہ حدیث اور تاریخ کے نقد کے معیار میں فرق کو روا رکھتے تھے۔ وہ خطیب البغدادی رحمہ اللہ کو بطور مثال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب "الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع" میں ان

---

1 السِّيرةُ النَّبَوِيَّةُ الصَّحِيْحَةُ مُحَاوَلَةٌ لِتَطبِيْقِ قَوَاعِدِ المُحَدِّثِيْنَ فِيْ نَقْدِ رِوَايَاتِ السِّيْرَةِ النَّبَوِيَّةِ: ص: 45

2 - السِّيرةُ النَّبَوِيَّةُ الصَّحِيْحَةُ مُحَاوَلَةٌ لِتَطبِيْقِ قَوَاعِدِ المُحَدِّثِيْنَ فِيْ نَقْدِ رِوَايَاتِ السِّيْرَةِ النَّبَوِيَّةِ: ص: 69

3 - الشريف حاتم بن عارف العوني، أرشيف ملتقى أهل الحديث-2، المكتبة الشاملة، 2010ء، 309:1

الفاظ سے باب باندھا ہے کہ اس کا بیان کہ جس کے بیان کے لیے سند کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے کہا کہ صالحین کی اخبار، متقین اور پرہیز گاروں کی حکایات، خطباء کے مواعظ، ادباء کے اقوال زریں کے لیے اسانید زینت کا باعث ضرور ہیں، لیکن ان کے نقل کرنے کے لیے شرط نہیں ہیں۔ پھر خطیب بغدادی نے یوسف الرازی رحمہ اللہ سے یہ نقل کیا ہے کہ حکیمانہ قول کی سند، خود وہ قول ہی ہے۔ اسی طرح عبد اللہ بن المبارک رحمہ اللہ سے سوال ہوا کہ ہم کتابوں میں بہت سے مواعظ [بلاسند] دیکھتے ہیں تو کیا ان میں غور کر لیا کریں تو انہوں نے کہا کہ کوئی حرج نہیں۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر کسی دیوار پر بھی کوئی نصیحت لکھی دیکھو تو اس میں غور ضرور کرو۔ ان سے جب یہ کہا گیا کہ فقہ کے بارے آپ کی کیا رائے ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ وہ سماع سے ثابت ہو گی۔[1]

محدثین کے ہاں حدیث اور سیرت کے قبولیت کے معیارات فرق تھے، اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ جب امام احمد رحمہ اللہ سے یہ سوال ہوا کہ آپ کی محمد بن اسحاق رحمہ اللہ سے حدیث لینے کے بارے کیا رائے ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ جیسے شخص سے ایسی احادیث لکھی جا سکتی ہیں اور ان کی مراد مغازی وغیرہ کی روایات تھیں۔[2] شیخ حاتم الشریف کہتے ہیں کہ ابن عدی جیسے امام جب یہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے کئی اساتذہ سے یہ بات سنی ہے کہ جب امام بخاری بغداد میں آئے تو اہل بغداد نے ان کے امتحان کے لیے سو حدیثیں ان کے سامنے رکھیں کہ جن کی سند اور متن کو الٹ پلٹ دیا تھا۔ شیخ حاتم الشریف کہتے تھے کہ ایک صاحب نے اس واقعے پر ضعیف ہونے کا حکم اس لیے لگایا کہ امام ابن عدی کے اساتذہ اس کے لیے مجہول ہیں حالانکہ امام ابن عدی کے اساتذہ، امام بخاری کے شاگرد ہیں اور ابن عدی کے لیے مجہول نہیں ہیں۔ تو ابن عدی کے لیے ان کے اساتذہ معروف ہیں اور وہ امام بخاری کے براہ راست شاگرد ہیں تو سند ابن عدی کے لیے تو متصل ہوئی۔

اگر معترض کا کہنا یہ ہو کہ ابھی تک تو آپ محدثین میں ہی گھوم رہے ہیں، تو یہ تو محدثین کا ہی دیا ہوا معیار ہے جو آپ سیرت اور تاریخ میں لاگو کر رہے ہیں۔ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ یہی دعوی تو ہم شروع سے کر رہے ہیں کہ

---

[1] ۔أرشيف ملتقى أهل الحديث-2: 306:1

[2] ۔ تهذيب الكمال في أسماء الرجال: 109:29

محدثین نے بھی حدیث کے ساتھ سیرت و تاریخ کے معیار تحقیق میں فرق کیا ہے البتہ کچھ معاصر محققین نے اس میں غلو اور سختی کی جو کہ مناسب نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہمارا کہنا یہ بھی ہے کہ سیرت نگاروں نے محدثین کے اس معیار تحقیق میں مزید اضافے کیے ہیں جیسا کہ واقدی کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک مغازی میں ان لوگوں سے روایت لینے کا اہتمام کرنا چاہیے کہ جن کے خاندان ان غزوات میں شریک رہے ہیں، چاہے وہ مجہول راوی ہی کیوں نہ ہوں، انہیں دیگر ثقہ راویوں پر ترجیح دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خاندان کا راوی ہونے کی وجہ سے اس نے اس کی تفصیلات کو یاد رکھنے میں زیادہ اہتمام سے کام لیا ہو گا۔[1] تو یہ کہنا کہ ایک دو چار کر کے وہ اصول بیان کر دیں کہ جن پر سیرت کے واقعات کو پرکھا جائے گا تو اس طرح تو اصول حدیث کی کتابوں میں بھی حدیث کی تحقیق کے اصول بیان نہیں ہوئے۔ تو انہیں اصول حدیث کی کتابیں عرفاً کہہ دیتے ہیں، اصلاً وہ مصطلح الحدیث اور علوم حدیث کی کتابیں ہیں، یہ قابل غور اور گہرا نکتہ ہے۔

علوم کی تقسیم شروع میں ہی ہو گئی تھی۔ سنت کی کتابیں علیحدہ مدون ہو رہی تھیں اور سیرت کی علیحدہ اور تاریخ کی علیحدہ۔ اور ہر ایک کے امام اور رجال معروف تھے۔ پھر طبقات، تراجم اور تاریخ کی کتب اور ان کے مناہج میں بھی فرق ہو گیا اور یہ تینوں علیحدہ علیحدہ فن کے طور معروف ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں ابن اسحاق، واقدی اور طبری رحمہم اللہ کا ذکر تو مورخ کے طور کرتے ہیں، لیکن ابن سعد رحمہ اللہ کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ان کا کام طبقات پر ہے۔ امام مالک کی "الموطا" اگر سنت کے اولین مصادر میں سے ہے تو واقدی کی "مغازی" سیرت کے اولین مصادر میں شمار ہوتی ہے۔ سنت کی تدوین میں جو مقام امام بخاری رحمہ اللہ کو حاصل ہوا ہے، وہی سیرت کی تدوین میں ابن سحاق رحمہ اللہ کا ہے۔ سنت کے ائمہ بھی سیرت اور تاریخ میں بعض اشخاص کی مہارت کے نہ صرف معترف تھے بلکہ قدر دان بھی تھے۔ مثال کے طور پر امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح بخاری میں "کتاب المغازی" کا آغاز اس جملے سے کرتے ہیں کہ ابن اسحاق نے یہ کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا غزوہ ابواء تھا، دوسرا ابواط اور تیسرا عشیرہ تھا۔ تو یہ دراصل امام بخاری نے ابن اسحاق کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔[2]

امام مالک رحمہ اللہ سے جب ایک شخص نے سوال کیا کہ جس یہودی عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ خیبر میں

---

1 ـ الواقدي وكتابه المغازي منهجه ومصادره: ص: 259

2 ـ صحيح البخاري: 71:5

زہر دیا تھا تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا؟ تو امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ میرے علم میں نہیں ہے، لیکن میں کسی صاحب علم سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ امام مالک کی واقدی سے ملاقات ہوئی اور اس سے پوچھا تو واقدی نے بتلایا کہ میرے پاس جو اخبار ہیں، ان کے مطابق اس عورت کو قتل کر دیا گیا تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے بعد میں سائل کو یوں جواب دیا: "قد سألتُ أهل العلم فأخبروني أنه قتلها"۔[1] "میں نے یہ بات اہل علم سے پوچھی ہے تو ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو قتل کروا دیا تھا۔" امام مالک رحمہ اللہ کی یہاں اہل علم سے کیا مراد ہے یعنی وہ لوگ جو سیرت کا علم رکھتے ہیں۔ اسی بات کو ابن حجر نے واقدی کے حالات میں یوں بیان کیا ہے: "متروك مع سعة علمه"۔[2] واقدی حدیث میں متروک ہے باوجود اپنی وسعت علمی کے۔ اب یہ اس کی کون سی وسعت علمی کا اعتراف ہو رہا ہے؟ ظاہری بات ہے، سیرت کی وسعت علمی مراد ہے۔

ماہرین فن کے ماہرین ہونے کا اعتبار خود محدثین نے کیا ہے لہذا یہ کہنا درست نہ ہو گا کہ ماہرین فن کو اپنے فن کی تحقیق کے اصول وضع کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ سیرت نگار، سیرت کی تحقیق اور مورخین، تاریخ کی خبر کی تحقیق کے اصول وضع کر سکتے ہیں بلکہ انہیں کرنے چاہییں، یہی معقول اور معتدل موقف ہے۔ مثال کے طور پر واقدی کو سیرت کی جمع وتدوین میں چار وجوہات سے جو امتیاز حاصل ہے، وہ محدثین کو اس پر حاصل نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ واقدی، سیرت کی جمع وتدوین میں محدثین سے مقدم ہے۔ دوسرا واقدی کا تخصص سیرت ہے یعنی اس نے سیرت کو جمع کرنے میں زندگی لگائی اور کھپائی ہے۔ تیسرا اس نے اپنی "مغازی" میں اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ وہ ہر غزوے کے مقام اور گردونواح کا جا کر عینی مشاہدہ کرے اور پھر اسے قلمبند کرے۔[3] چوتھا اس نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ہر غزوے میں شرکت کرنے والوں کی اولاد سے اس غزوے کے بارے میں خبریں حاصل کرے کہ اس کے خیال کے مطابق اس خاندان میں وہ خبریں نسل در نسل جاری ہوئی ہوں گی اور زیادہ محفوظ رہی ہوں گی کہ لوگوں کا اپنی خاندان کے بڑوں کی تاریخ کو محفوظ رکھنے میں اہتمام فطری طور پایا جاتا ہے۔[4]

---

[1] ۔ تاريخ بغداد: 5:4

[2] ۔ ابن حجر العسقلاني، تقريب التهذيب، دار الرشيد، سوريا، الطبعة الأولى، 1406ھ، ص: 498

[3] ۔الواقدي وكتابه المغازي منهجه ومصادره: ص: 255-258

[4] ۔ أيضاً: ص: 259

خلاصۂ کلام

حدیث اور سیرت کے تحقیقی معیارات میں کیا نمایاں فرق ہے؛ پہلا یہ کہ سنت اور حدیث کی تدوین کے لیے سماع ضروری ہے یعنی سنت، تحمل واداء سے نقل ہوتی ہے جبکہ سیرت اور تاریخ کی تدوین کے لیے سماع ضروری نہیں بلکہ ان کی تدوین اور نقل کتب سے بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے واقدی کی "مغازی" کے مصادر میں اخبار کے علاوہ کتب بھی شامل ہیں۔ سیرت کی تدوین میں کتب کو مصادر مان لینے کی مثال جدید اصطلاح میں ریاست کا آرکائیوز ڈیپارٹمنٹ ہو سکتا ہے۔ صلح حدیبیہ، میثاق مدینہ اور شاہان عجم کو لکھے جانے والے خطوط وغیرہ سیرت کے کتابی مصادر میں شامل ہیں۔ اس میں صحابہ کرام کی لکھائی گئی وصیتوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ سیرت کی تدوین اور نقل میں ماہر فن کے لیے یہ عیب نہیں کہ وہ ایک سے زائد اسناد کے متون کو ایک متن کے طور پر ایک جماعت سے نقل کر دے کہ اس میں واقعہ اصل ہے نہ کہ سند۔ اور یہ کام امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ نے حدیث میں تو نہیں کیا، لیکن سیرت میں کیا ہے۔ اور ابن اسحاق رحمہ اللہ نے بھی یہی کام سیرت میں کیا ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ حدیث میں مرسل اور منقطع روایت قابل قبول نہیں ہیں، لیکن سیرت اور تاریخ میں ایسی روایات قبول کر لی جاتی ہے جب تک کہ راوی کذاب نہ ہو یا اس پر تہمت کذب نہ ہو۔ واقدی کو اگر کسی نے کذاب کہا بھی ہے تو اس وجہ سے کہ وہ مختلف اسناد کے متون کو ملا کر ایک ساتھ نقل کر دیتا ہے، لیکن یہی کام اس سے پہلے ابن اسحاق بھی کر چکے اور ابن شہاب زہری بھی، لیکن سیرت میں کیا۔ چوتھا فرق یہ نقل ہوا کہ سیرت کے واقعات اور تاریخی اقوال بغیر سند کے بھی نقل ہو سکتے ہیں جیسا کہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ کا قول نقل ہو چکا کہ کچھ علوم کے نقل کے لیے سند کا ہونا ضروری نہیں، لیکن حدیث اور سنت، سند کے بغیر نقل نہیں ہو سکتی۔ اور قرون وسطی (middle ages) کے بعد کی اسلامی تاریخ کی تو سند ہے ہی نہیں۔ یہ تو اوائل اسلام کا امتیاز ہے کہ اس دور میں تاریخ کی بھی سند محفوظ کرنے کا اہتمام کیا گیا ورنہ تاریخ کہاں سند سے نقل ہوتی ہے؟ تو ایسی تاریخ کو پرکھنے کے اصول اخباری نہیں بلکہ عقلی، طبیعی اور آثاری ہوں گے مثلاً علم الآثار (archeology) ایک باقاعدہ سائنس بن چکا کہ جس کے ذریعے قوموں اور تہذیبوں کی تاریخ، ثقافت، عقائد و نظریات اور رہن سہن کو جانا جاتا ہے۔